© rasailojaraid.com

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

علوم جدید کو مسلمان بنانے کی ضرورت

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ تعلیم میں جدید وقدیم امتزاجی نظریہ کامل نیک نیتی اور خیر اندیشی کی پیداوار ہے جن بزرگوں نے جب بھی امتزاج کے اصول پر تعلیمی تشکیل کی کوشش کی ان کے مدِنظر ہمیشہ یہ رہا کہ جہاں قدیم علوم ہمارا قیمتی ورثہ ہیں جو بدستور زندہ رہنے کے حق دار ہیں وہاں نئے علوم بھی حقیقی قدر و قیمت کے مالک ہیں۔ پس ان سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی۔ لہٰذا کسی طریقے سے ان دونوں سلسلوں کو باہم ملانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔

انگریزوں کے زمانے کے ہندوستان میں اس سمت میں پہلی پیش قدمی ندوۃ العلماء کی تشکیل تھی جسے اگر مکمل طور پر کامیاب نہ بھی کہا جائے تو بھی اسے ناکام نہیں کہا جاسکتا اور میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کی اپنی حکومت ہوتی اور اس امتزاجی سلسلے کو اپنالیتی تو اس سے بہت اچھے نتائج برآمد ہوتے۔ لیکن حکومت غیر ملکی تھی، اسے اس قسم کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ندوۃ العلماء سے یہ تو ہوا کہ علوم اسلامیہ کے لئے کچھ ایسے شارح ناقد اور محقق پیدا ہوگئے جو انگریزی زبان اور مغربی انداز نقد و نظر سے آگاہ ہوئے اور انہوں نے اپنے دور میں کلام اور تاریخ و تہذیب میں وقیع کام بھی کر دکھایا لیکن ندوۃ دیر تک یعنی مستقلاً جوہرِ قابل پیدا کرنے کے قابل نہ ہوسکا نہ اس کی مقبولیت قائم و دائم رہی۔

اس صورت حال کے چند در چند اسباب تھے جن پر غور لازم ہے۔

وہ تعلیم جو صرف علمی اکتساب کے مقصد سے دی جائے اور اس کا دنیوی منفعت یا کسی مادی غایت سے تعلق بالکل منقطع ہو، رفتہ رفتہ محدود ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ ہماری قدیم تعلیم ہر چند بقول امام غزالیؒ حصول رضائے الٰہی کے لیے ہوتی تھی۔ تاہم ٹھوس مادی مقصد سے کبھی منقطع نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک زمانہ وہ تھا جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم کی دو واضح قسمیں سامنے آگئی تھیں۔ شرعیات اور فضلیات ثانی الذکر کا ملاً ملازمتوں کے لئے مخصوص تھی اور غور سے دیکھا جائے تو شرعیات میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ذریعہ معاش کا تھا۔

ندوہ کی تعلیم سے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے علم و تحقیق کا ذوق وشوق باحسن وجوہ پورا ہوا لیکن ندوے کی سند دنیوی لحاظ سے کم نفع تھی۔ اس کے مقابلے میں علی گڑھ کی سند سے ملازمتیں اور منصب ملتے تھے۔ اب کوئی لاکھ تجریدی اور قناعت پیشہ ہوجائے جب تک اسے زندہ رہنا ہے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور اگر معاش کے ساتھ منصب اور جاہ بھی ہو تو کشش بے پناہ ہوجاتی ہے۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ محض جامعیت ندوے کے کسی کام نہ آئی۔ علی گڑھ بازی لے گیا اور ندوہ چند محقق ندویوں کے سوا کچھ کشش پیدا نہ کرسکا۔ لوگ دھڑا دھڑ انگریزی مدرسوں میں گئے اور ندوہ دیکھتا رہ گیا ؎

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے

شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسہ نہ ملا! (اکبر)

یوں جامعیت اچھی شے ہے لیکن اس کے ساتھ عملی طور سے مفیدیت بھی لازم ہے۔

ہر نظامِ تعلیم کے ساتھ لازماً یہ تعارف لازمی ہے کہ اس کے فارغ التحصیل حضرات کی کھپت کہاں ہوگی؟ جب تک اس سوال کا جواب کوئی ادارہ نہیں دے سکتا، اس وقت تک اس میں داخلہ لینے والے ہزار مرتبہ سوچیں گے اور یوں داخلہ لینے والے بھی کم ہی ہوں گے اور جتنے ہوں گے صرف وہ ہوں گے جنہیں کسی رائج الوقت سرکاری مدرسے میں جگہ نہیں ملتی یا وہ اس کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے۔

ندوے کا تجربہ بار بار دہرایا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ کے بعد دہلی) میں ایک خاص نمونے پر دوئی کو مٹانے کا دعوی کیا گیا بلکہ اس کے لئے مناسب تشکیل بھی ہوئی جو قدرے کامیاب بھی ہوئی مگر حکومتِ ہند کی ساری سرپرستی کے باوجود جامعہ کی سند وہ درجہ حاصل نہیں کرسکی جو سرکاری درسگاہوں کی سندات کو حاصل ہے۔ اگرچہ جامعہ کا طالب ایک خاص نقش لے کر باہر آتا ہے مگر اس کی انفرادیت اسے کوئی مخصوص انسان نہیں بناتی۔ کم ازکم اس کا ماحول اسے ایسا نہیں سمجھتا۔

جامعہ محمدی (جھنگ) میں اسی قسم کا نظریہ کارفرما ہے اور جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے پیچھے بھی یہی روح کارفرما ہے۔ شاہ ولی اللہ کالج منصورہ کے بزرگ بھی اگرچہ قدیم وجدید کی نتیجہ خیز آمیزش کے لئے کوشاں ہیں مگر جتنا غور کیا جائے یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ قدیم اورنٹیل کالج لاہور کے اسلوب تعلیم کی نقل ہے جس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدیم سلسلہ عالم و فاضل میں معمولی ترمیم کر کے اس کے ساتھ انگریزی لگادی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح جامعیت مکمل ہو جاتی ہے۔

میری ناقص رائے میں اس طرح جامعیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ صرف پیوند کاری ہے اور معلوم ہے کہ پیوند کاری سالم (INTEGRATED) اور مربوط نظام کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اب تک جامعیت کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کی یہی خامی ان کی ناکامی کا موجب بنی ہے کہ ان میں مختلف اجزا کو کسی رُوح کے بغیر باہمی ملا دیا گیا ہے اور یہ نہیں دیکھا گیا کہ نظام میں وحدت پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔

کسی نظامِ تعلیم میں وحدت تبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کے اجزا باہم شیر و شکر ہو جائیں اور یہ شیر و شکر ہونے کی کیفیت تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب سارے نظام کی روح ایک ہی ہو۔ اجزا جُدا بھی ہوں تو مضائقہ نہیں مگر اجزا میں وحدت پیدا کرنے والی روح یعنی بنیادی فلسفہ ضرور ایک ہونا چاہیئے۔

بد قسمتی سے پیوند کاری والی درسگاہوں میں اجزا تو جمع کر دیئے جاتے ہیں مگر ان کو وحدت میں ڈھالنے والا کوئی فلسفہ موجود نہیں ہوتا۔

کسی نظامِ تعلیم کے فلسفے کی تعیین ان غایات و مقاصد سے ہوتی ہے جو کسی تعلیم کے مدِ نظر ہوتی ہے۔ لہذا یہاں سوال مقاصد کا پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہے کہ مقاصد میں زیادہ شہرت و مقبولیت اس بات کو حاصل رہی ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد مکمل نہ سہی کم از کم اچھے انسان پیدا کرنا ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ اس ایک فقرے کی سینکڑوں شرحیں اور تاویلیں ہوئی ہیں اور اچھے انسان کی تعریف پہ بیسیوں کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔

کسی اسلامی طرز کے نظامِ تعلیم میں یہ مقصد بہرحال مدِ نظر رہے گا کہ اس کے فارغ التحصیل لوگ اوروں سے زیادہ خدا شناس اور خدا رسیدہ ہوں گے اور یہ بھی مدِ نظر رہے گا کہ وہ اس طرح کے اچھے انسان ہوں گے جس طرح کے انسان قرآن مجید کے مدِ نظر ہیں۔ یہ دونوں مقاصد نظامِ تعلیم کے سب اجزا میں جاری و ساری ہونے چاہئیں تب جا کر اسلامی فلسفہ تعلیم اجاگر ہو گا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا پیوند کاری میں یہ دونوں مقاصد پورے ہو سکتے ہیں ؟ جواب نفی میں ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ پیوند کاری کے دو اجزاء باہم متضاد ہیں۔ اس کا قدیم جز دینی اور اخلاقی (روحانی) ہے اور اس کا دوسرا جز سراپا دنیویت زدہ (SECULAR) دین بیزار اور اخلاق دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں اجزاء میں ملاپ ممکن نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶

ممکن ہے بعض ایسے حضرات جن کی نظر مغربی (انگریزی) علوم و ادب پر وسیع اور گہری نہیں یہ کہہ دیں کہ انگریزی محض زبان ہے اور زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا یا مغربی علوم بہر حال علم ہیں اور علم سب اچھے ہوتے ہیں لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ یہ غلط فہمی یا بے خبری ہے۔ میرے نزدیک ہر زبان ایک خاص مذہب یا تہذیب کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے اور اس مذہب یا تہذیب کے نقوش اس کی شخصیت میں موجود ہوتے ہیں جنہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح علوم پر بھی متعلقہ تہذیب کا نقش ہوتا ہے جسے صاف پہچانا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان بلاشبہ اپنے ارتقائی دَور میں روحانی و اخلاقی اثرات میں سے گزری ہے مگر گزشتہ دو سال میں انگریزی بتدریج روحانی اثرات سے نکلتی گئی اور اب وہ ایک ایسی زبان ہے جس کی رُوح میں مادیت اور وہ "قانونیت" بسی ہوئی ہے جو ڈپلومیسی کے مقاصد کے لئے مفید ہے۔ یہ زبان بلاشبہ عظیم ہے مگر اس کا ادب محض دنیا پرستی سکھاتا ہے اور اگر اس میں کچھ اخلاقیت ہے بھی تو وہ عیسائیت کی اخلاقیت ہے۔ باقی رہے علوم سو وہ خالصتاً مادہ پرستانہ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ زبان کا "مذہب" تبدیل کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ لکھنے والے اس کو نئے مطالب سے بھر دیں لیکن ہمارے ملک کے انگریزدان یہ کام نہیں کر سکے۔ یہ صرف مغرب کی ثناخوانی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو کچھ انگریزی حرفوں میں لکھا ہوا یورپ سے آتا ہے، برتر الہام کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی حال علوم کا ہے۔ انہیں بھی "مسلمان" بنایا جا سکتا ہے لیکن مغربی علوم سے آشنا طبقے اپنے موجودہ انجماد ذہنی کی صورت میں یہ کام نہیں کر سکتے۔

ان حالات میں جامعیت کی آرزو رکھنے والی درسگاہوں میں جدید کا پیوند بالعموم بیکار رہتا ہے اور وہ نتیجے بھی پیدا نہیں کر سکتا جو خالص قدیم اور خالص جدید درسگاہوں میں کچھ نہ کچھ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس ناقص پیوندکاری کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ جامعیت کی طلب گار درس گاہوں کے طلبہ ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں اور مروج سرکاری درسگاہوں کے لوگ انہیں کمتر سمجھتے بھی ہیں۔ یہ لوگ تو خالص قدیم دینی اداروں کو بھی کمتر ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن قدیم اداروں کے فارغ التحصیل اپنے دائرہ علوم میں وسعت اور گہرائی کی وجہ سے "پیوندکار" اداروں کے مقابلے میں ہزار درجہ پُراعتماد ہوتے ہیں اور دینی علوم کی حد تک ان کی انا مطمئن اور ان کی شخصیت خود شعوری سے مالا مال ہوتی ہے۔ اسی لئے ان درسگاہوں سے اب بھی عظیم شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس وقت تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد طلبہ کو معاش کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ "پیوند کار" ادارے معاش کا مناسب وسیلہ بن سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ان اداروں کے طلبہ کو اس کے لئے بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی۔

سطور بالا میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں "پیوند کار" اداروں کی حوصلہ شکنی کر رہا ہوں۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ یہ ادارے دراصل اس غایت کی طرف ایک تدریجی قدم کا درجہ رکھتے ہیں جس کی ہم کو آرزو ہے۔ ان کی سمت ٹھیک ہے اور ان کی کوششیں تجربوں کا درجہ رکھتی ہیں اور ان تعلیمی معماروں کی نیت بہرحال نیک ہے۔

میں صرف یہ آرزو رکھتا ہوں کہ نقشہ ٹھیک بنے، منزل متعین ہو اور موجودہ پیوندکاری رفتہ رفتہ اس سچی جامعیت میں ڈھل جائے جو وحدت کی ضامن ہو۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ، تجربے میں کچھ مضائقہ نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سچی جامعیت وسیع تر قومی آرزو ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس کی کامیابی کی ضمانت صرف حکومتیں ہی دے سکتی ہیں۔ ہمارے انفرادی تجربے تو صرف آرزو اور خواہش کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں ہر حال مبارک اور باعث خیر و برکت ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس جامعیت کا جس کی ہمیں آرزو ہے مختصر سا تجزیہ مفید ہوگا۔

میری دانست میں ملک میں تعلیم کے دو مختلف کیمپ انگریزی دَور کی غلامانہ یادگار ہیں۔ قومی و سرکاری سطح پہ تعلیم کا نظام صرف ایک ہی ہونا چاہیئے۔ (اس سے میں دینی مدارس کو مستثنیٰ کرتا ہوں، کیونکہ وہ تخصص کے ادارے ہیں اور ان کی اپنی افادیت ہے) بہرحال سارے ملک کی قومی تعلیم کا سلسلہ صرف ایک ہی ہونا چاہیئے اور اس کا نظام و نصاب اس طرح مرتب ہونا چاہیئے کہ قدیم علوم (بشمولِ دین) کے ضروری حصے عام تعلیم کے ڈھانچے کے اندر جذب کر دیئے جائیں، علومِ جدید کی تعمیرِ نو کر کے ان کے ضروری حصے تعلیم میں شامل کیے جائیں۔ ذریعہ تعلیم اردو ہو اور عربی کو میٹرک تک لازمی مضمون قرار دیا جائے اور انگریزی صرف کاروباری قسم کی رکھی جائے۔ البتہ زبانوں میں انگریزی ادب کا پورا مضمون ہو۔ بے ضرورت مضمون خواہ وہ قدیم کے ہوں یا جدید کے خارج کر دیئے جائیں یا ضرورت ہو تو اختیاری کی فہرست میں رکھ دیئے جائیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ لازمی ہے کہ علوم قدیم کی تشریح جدید کی جائے۔ اور علوم جدید کو "مسلمان" بنایا جائے۔ یعنی اسلامی فکریات کی روشنی میں ان کی تنقید بھی ساتھ ہی موجود ہو۔ تب جا کر موجودہ دو عملی ختم ہوگی اور کمتری اور برتری کی لعنت دُور ہوگی لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ یہ تو مجاہدینِ علم کا کام ہے۔ اہلِ تشکم میں ان مفاخر و معالی کی ہمت کہاں؟

ٹ ٹ ٹ

© rasailojaraid.com